قدسیہ بانو عبدالکریم
شعبہ اردو، جناح یونیورسٹی برائے خواتین، کراچی

تمثیلی مشاعروں کی علمی و ادبی اہمیت

Qudsia Bano Abdul Karim

Department of Urdu, Jinnah University for Women, Karachi

Literary Importance of Allegorical Mushaira

Mushaira is an age old tradition of Indian civilization; today mushaira has turned into a cultural institution and an ambassador of Urdu language. One such tradition is of allegorical mushairas which are also called "jannati mushairas", these are the dramatic reproduction of those memorable mushairas which are a part of our literary history. Seven allegorizations have been referred to and light has been thrown on the importance of allegorical mushairas.

مشاعرہ ہمارے ادب کی دیرینہ روایت ہے اور اس ہند المانی تہذیب کی یادگار ہے جس میں اردو زبان کا آغاز ہوا ۔اردو زبان وادب کے آغاز وارتقا میں مشاعروں نے بڑا فعال کردار ادا کیا ہے۔قدیم مشاعرہ نو واردان بساط شاعری کے لیے ایک تربیتی ادارے کی حیثیت رکھتا تھا اور قدیم تہذیب وشائستگی کا مظہر بھی تھا۔عہد قدیم سے عہد جدید تک آتے آتے تغیرات زمانہ نے اس کی فضا اور ماحول کو بھی بدل دیا ہے۔آج مشاعرہ ایک بہت بڑے ثقافتی ادارے میں تبدیل ہو چکا ہے اور اردو کا سفیر بن کر ساری دنیا میں اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔عہد گذشتہ ہو یا عہد حاضر مشاعرے ادب کے خزانے میں اضافے کا ذریعہ بھی رہے ہیں۔مشاعروں کی بدولت منظوم کلام کے ساتھ تذکرے، گلدستے، یادگاری مجلّے اور مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اردو کے قدیم مشاعروں کے حوالے سے ایک اہم اور دلچسپ سلسلہ تمثیلی مشاعروں کا بھی ہے جنہیں ''جنتی مشاعرے'' بھی کہا جاتا ہے۔تمثیل کا لفظ اردو زبان میں کئی مفاہیم میں استعمال ہوتا ہے تمثیل سے مراد نقل یا ڈرامہ بھی لی جاتی ہے۔لفظ تمثیل دراصل مثال کی صورت ہے۔تمثیل کا لفظ انگریزی کے لفظ ایلگری Allegory کے مترادف کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے انگریزی میں تمثیل کے لیے Fable اور Parable کا لفظ بھی مستعمل ہے۔یہ ایسی کہانیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں انسانی اخلاق وصفات کو مجسم کرداروں کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے اور جس کی کہانی دو سطحوں پر ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

تمثیلی یا جنتی مشاعرہ ان مشاعروں کو کہا گیا ہے جن میں قدیم مشاعروں کے ماحول اور کلاسیکی شعراء کی بزم

آرائیوں کو ڈرامائی شکل میں پیش کیا جاتا ہے گویا یہ ان قدیم یادگار مشاعروں کی نقل ہے۔ جس میں مرحوم شعراء کی نمائندگی مختلف افراد سے کروائی جاتی ہے ارسطو نے فن تمثیل کو اظہار کے اعلیٰ فن سے تعبیر کیا ہے کیونکہ تمثیل الفاظ کے ساتھ کچھ کر کے دکھانے یعنی عمل کا فن بھی ہے کیونکہ تمثیل میں الفاظ کے ساتھ اداکاروں کا رنگ روپ، وضع قطع اور چہرے کے تاثرات اور حرکات و سکنات اسٹیج پر آرائش اور ماحول کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں تو بھرپور تاثر قائم کرتے ہیں اور ''اپنی اپنی فہم اور ذوق کے مطابق عارف اور عامی دونوں اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں''۔(۱) شاعر کے کلام کی تفہیم میں یہ تماثیل معاون ہو سکتی ہیں۔ فرحت اللہ بیگ نے یادگار مشاعرہ کی تمہید میں لکھا ہے کہ:

''جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی صورت، حرکات و سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ یہ کہ اس کا لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اس کا کلام خاص اثر پیدا کر دیتا ہے اور پڑھنے والے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ورنہ مصنف کے حالات سے واقف ہوئے بغیر اس کی کتاب پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ موثر نہیں ہوتا۔''(۲)

اردو میں تمثیل مشاعروں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ''مرزا فرحت اللہ بیگ'' کے ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' کو پہلا تمثیلی مشاعرہ کہا جاتا ہے جو ۱۸۴۶ کے ایک یادگار مشاعرے کی تمثیل ہے اور ۱۹۲۶ میں احسن مارہروی کے مقدمے کے ساتھ شایع ہوا لیکن اس تصنیف سے بہت پہلے اردو ڈرامہ نگاری کے بانی واجد علی شاہ اختر نے اپنی ایک کتاب ''بنی'' (جو مختلف موضوعات پر مبنی ہے) کے پانچویں باب میں فارسی اور اردو کے شاعروں کی نقل تیار کی ہے، یہ نقل بھانڈوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ ''بنی'' کا سن تصنیف ۱۸۷۷ ہے اس کتاب کا ذکر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنے ایک مضمون ''واجد علی شاہ کی ایک نادر تصنیف'' مطبوعہ نقوش ادب عالیہ نمبر اپریل ۱۹۴۰ میں کیا ہے نیز علی جواد زیدی نے بھی ''تاریخ مشاعرہ'' میں اسے تمثیلی مشاعرے کا نقش اول قرار دیا ہے۔

واجد علی شاہ کی کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے جس کا ایک حصہ ''مشاعرے کی نقل'' کے عنوان سے لکھا ہے جس میں ۵۶ ہندی اردو، فارسی اور ایرانی شعرا کو شامل کیا ہے۔ سب سے پہلے ناسخ اور سب سے آخر میں جرأت کا نام ہے بہادر شاہ ظفر اور خود واجد علی شاہ مشاعروں میں شامل ہیں اور چند خواتین شاعرات کے نام بھی ہیں۔ شعراء کی ترتیب نہ تاریخی ہے نہ حروف تہجی کے اعتبار سے اور نہ ہی شاعرانہ مرتبہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ شعرا کا تعارف عموماً صرف ایک جملے میں ہے۔ یہ آتش ہیں، یہ انشا ہیں وغیرہ جرات کا تعارف کچھ عجیب انداز سے کروایا ہے جس سے ہمیں اس دور کی پست مذاقی کا اندازہ ہوتا ہے۔

''اندھے جرات کا ناقل کہے کہ جرات تو اب پیدا ہوتے ہیں یہ کہہ کر ٹانگیں چیر کر کھڑا ہو جائے اور دوسرا آدمی ٹانگوں کے نیچے سے چہرہ نکال کر کہے کہ اے باوا! سامنے والا کہے کہ بیٹا کیا ہے وہ جواب دے باوا پھنس گیا سامنے والا کہے کہ بیٹا جرات ہو تو نکل آ بس وہ فوراً اس کلمے کے ساتھ نکل آئے پھر جرأت کا نقال اپنی آنکھیں اندھوں کی مانند بنا کر کہے کہ قربان جاؤں اندھوں کا شعر بھی اندھا ہوتا ہے ساتھ والے کہیں کس طرح۔ اس وقت یہ مطلع میاں جرات کا نابینا پڑھتا جائے اور دونوں ہاتھوں سے اندھوں کی طرح ٹٹولتا جائے۔ مطلع جرأت

سنا ہے یار کی ہم نے کمر ہے
کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

مگر یہ نقل تمام شاعر کے بعد ہو۔''(۳)

جرات کی نقل سب سے آخر میں رکھنے کا مقصد شاید یہ ہو کہ مشاعرے کی سنجیدگی باقی رہے لیکن پھر بھی پست مذاقی جو اس دور کے مزاج میں در آئی تھی ظاہر ہو رہی ہے۔

واجد علی شاہ نے ہر شاعر کی ایک ایک غزل کا مطلع لے کر مشاعرے کی نقل بنائی ہے ہر شاعر کا پورا نام بتایا گیا ہے بعض شعراء کے بارے میں کچھ تفصیل بھی بتائی ہے اور بعض شعراء کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ نقل کس طرح کرنی ہے واجد علی شاہ نے یہ تمثیل بھانڈوں کے نقل کے لیے لکھی ہے اور اس کا مقصد صرف تفریحی ہے باوجود اس کے یہ اس دور کے ماحول خاص طور سے مشاعروں کے ماحول کے چند پہلو ضرور اجاگر کرتی ہے۔ واجد علی شاہ کی اس تصنیف کو تمثیلی مشاعروں کا نقش اول قرار دیا جاسکتا ہے۔

باقاعدہ تمثیل کے طور پر سب سے پہلے فرحت اللہ بیگ نے ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ لکھا یہ مشاعرہ (۱۸۴۶ع، ۱۲۶۱ھ) میں شاہی سرپرستی میں منعقد ہونے والے مشاعرے کی نقل ہے۔ جس کا ذکر مولوی کریم الدین نے ''طبقات الشعراء'' میں عارف زین العابدین'' کے ذکر میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''یہ مشاعرہ میرے مکان پر چودھویں تاریخ ماہ رجب ۱۲۶۱ ہجری میں شروع ہوا۔۔۔ جب تک وہ مطبع میرے پاس رہا مشاعرہ پندرھویں روز رچھا کیا''۔ (۴)

فرحت اللہ بیگ نے بھی طبقات الشعرا کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس کتاب میں لکھے گئے مشاعرے کے ذکر اور آزاد کی نیرنگ خیال کی محفل شعراء کو پڑھنے سے ان کا ذہن ایک ایسے تمثیلی مشاعرے کو لکھنے کے لیے آمادہ ہوا۔ محمد حسین آزاد نے ''آب حیات'' میں بھی شعرا کی قلمی تصویریں بنائی ہیں اور ''نیرنگِ خیال'' کی جس محفل شعرا کا ذکر فرحت اللہ بیگ نے کیا ہے وہ ہمارے خیال میں آزاد کے مضمون ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار'' کے اس حصے کی طرف اشارہ ہے جس میں اردو اور فارسی کے شعراء کا ذکر ہے۔

آزاد کی ''نیرنگِ خیال'' کی خیالی محفل اور طبقات الشعراء کے مشاعرے کا ذکر ''دہلی کا یادگار مشاعرہ'' کی تحریر کا محرک بنا۔ یہ تمثیلی مشاعرہ انتہائی دلچسپ ہے۔ یہ اس دور میں قلعہ معلّٰی کے ماحول اور طرزِ معاشرت کا بھرپور عکاس ہے۔ نیز اس دور کے مذاق شعروادب، شعراء اور کارکنان مشاعرہ کی شخصیت طرزِ زندگی، خصائل وعادات، آپس کی چشمکیں، شاہانہ وقار طرز تکلم، مشاعرہ گاہ کی آرائش وزیبائش، مشاعرے کے آداب نشست وبرخاست، شعرخوانی کا انداز، اور تنقید اس قدر دلکش انداز میں تحریر کی گئی ہے کہ حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

فرحت کے طرزِ نگارش نے انہیں چشم دید بنا دیا ہے۔ صرف کلام پڑھنے سے وہ اثر وتاثیر پیدا نہیں ہوتی جو حالاتِ زندگی وضع قطع، شکل وصورت، اور شخصیت کی خصوصیات جان کر ہوتی ہے۔ ڈرامہ بھی تخلیقی فنون میں اسی وجہ سے اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں مکالمے کے ساتھ عمل بھی ہوتا ہے۔ یہ تمثیلی مشاعرہ بھی کئی بار اسٹیج پر پیش کیا جاچکا ہے۔ سب سے پہلے اسے اورنگ آباد میں کالج ڈے کے موقعے پر اسٹیج کیا گیا تھا اسٹیج ڈائریکٹر کے فرائض خود فرحت اللہ بیگ نے انجام دیے تھے۔ یہ تمثیل اپنے بھرپور تاثر کی بنا پر قارئین اور ناظرین کے ذہنوں میں محفوظ ہے۔ فرحت کا مقصد بھی یہی تھا وہ لکھتے ہیں۔

> ''ایک ایسا چراغ روشن کرلوں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں، زبان اردو کے محسنوں کی شکلیں (خواہ دھندلی ہی کیوں نہ سہی) دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کی صورتوں کا ایک موہوم سا نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے بھر جائے''۔ (۵)

فرحت اللہ بیگ نے مشاعرے میں اس دور کے تقریباً تمام بڑے بڑے شعراء کو شامل کر دیا تقریباً ۶۵ افراد شریک مشاعرہ ہیں جن کی مختلف طبیعتوں اور عادتوں کا ذکر نہایت خوبی سے کیا ہے۔ کریم الدین کے مطبع خانے اور تذکرے کے لیے جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں اتنے شاعر شریک نہیں ہوتے تھے۔

یہ مشاعرہ ہماری گذشتہ ادبی روایتوں، لباس آداب معاشرے کا عکاس ہونے کے ساتھ ساتھ تفریح طبع کا بھی

سامان ہے اس میں تاریخی عنصر بھی پایا جاتا ہے حالانکہ یہ تاریخی مضمون نہیں لیکن کیونکہ یہ ایک مخصوص عہد کے بارے میں معلومات کا ذریعہ ہے اس میں درج معلومات کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

فرحت اللہ بیگ کے اس تمثیلی مشاعرے نے بعد میں آنے والوں کے لیے راہ کھول دی اس کے بعد کئی تمثیلی مشاعرے لکھے گئے۔ خود فرحت کا خیال بھی یہی تھا کہ اس طرح شاید کوئی اس سے بہتر ''ان خفتگانِ خاک کا مرقع تیار کر لے جو بزم ادبِ اردو میں سجانے کے قابل ہو''۔ (۶)

دوسرا معروف تمثیلی مشاعرہ احسن مارہروی کا تحریر کردہ ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں انٹرمیڈیٹ کالج کے طلبہ کی ایک ادبی انجمن ''انجمن خیابان اردو'' کے نام سے قائم تھی جس کے تحت ہر سال ایک یادگار مشاعرہ ہوتا تھا۔ جس میں برصغیر کے بڑے بڑے شعراء شرکت کرتے تھے۔ انجمن خیابان اردو کے بانی مولانا احسن مارہروی تھے جو شعبہ اردو کے لیکچرار تھے مولانا کی خواہش تھی کہ طلباء میں شعر و سخن اور علم و ادب کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے ۱۹۲۹ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ عام مشاعرے کے علاوہ ایک تمثیلی مشاعرے کا بھی اہتمام کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مولانا احسن مارہروی نے رامپور کے ایک مشاعرے کو تمثیلی انداز میں لکھا جس میں منیر، تسلیم، امیر، جلال، اسیر، بحر، اور داغ وغیرہ کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

مولانا رام پور کے دربار کے بعض اساتذہ سے ذاتی طور پر واقف تھے اس کے علاوہ انہوں نے امیر مینائی کے خلف اکبر صریر مینائی سے معلومات حاصل کیں کئی کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ بڑی مشکل سے قدیم شعراء کی مشابہتوں اور لباس کا تعین ہوا اور ۷ دسمبر ۱۹۲۹ کو ۸ بجے بعد نماز عشاء نیو سرکل کے میپرس یونین ہال میں عام مشاعرہ ہوا جس میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر راس مسعود نے شرکت کی اور دوسرے دن ۸ دسمبر کو تمثیلی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں کالج کے لڑکوں نے شعراء کا کردار ادا کیا۔

یہ تمثیلی مشاعرہ ۱۸۷۸ کے اس مشاعرے کی نقل ہے جو نواب کلب علی خان والئی رامپور کے زمانے میں جناب امیر مینائی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ امیر مینائی نواب رامپور کے استاد بھی تھے۔

مولانا احسن مارہروی نے مشاعرے میں شریک شعراء کے احوال الگ الگ تحریر کیے ہیں۔ ہر شاعر کی ایک ایک غزل شاعر کا کردار ادا کرنے والے طالب علم کا نام اور کلاس درج ہیں اس میں اصلی اور نقلی شعراء کے تمام کوائف درج ہیں شروع میں ایک اجتماعی تصویر اور نشست گاہ کا نقشہ بھی دیا گیا ہے۔ یہ تمثیل کے ساتھ اپنی نوعیت کا ایک انوکھا تذکرہ بھی ہے۔ یہ ۱۹۳۰ کے انٹرمیڈیٹ کالج میگزین میں شائع ہوا تھا۔ دوسری بار اسے احسن مارہروی اکیڈمی نے تعارف نو کے ساتھ ۱۹۹۵ میں شائع کیا ہے۔

طلبہ میں شاعری اور شاعر سے دلچسپی پیدا کرنے کے دو انداز بڑے موثر ثابت ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہیں شاعر کی تصویر اور حالاتِ زندگی بتائے جائیں دوسرے یہ کہ شاعر کو چلتا پھرتا بولتا چالتا دیکھنے کے ساتھ کلام شاعر بزبانِ شاعر سنیں تو ان کا شوق اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ کچھ اسی قسم کے خیالات کے پیش نظر لائل پور کالج کے پروفیسر محمد عبداللہ نے مشاعرے کی ایک تمثیل کے ذریعے طلبہ کے شوق اور دلچسپی کو مہمیز کرنے کا ارادہ کیا اور پنڈت کیفی سے اظہار مدعا کیا کہ وہ غزلیات کے انتخاب میں ان کی معاونت کریں۔ مارچ ۱۹۳۹ میں انہوں نے تعلیم سخن کے لیے منتخب کردہ دس بارہ شعراء کی غزلیں انھیں سے پڑھوانے کے خیال سے اس تمثیل کا ڈول ڈالا۔

پنڈت کیفی نے غزلوں کا انتخاب کرنے کے ساتھ تمہید کے طور پر ہدایات بھی لکھ دیں جو اسٹیج پر پیش کیے جانے کے لیے تھی اور دوران مشاعرہ ہر شاعر کی غزل کی داد بھی لکھ دی الغرض پروفیسر عبداللہ کامل کی تجویز پر مشاعرے کی تمثیل پنڈت دتا تریہ کیفی نے لکھی۔

یہ تمثیل کسی قدیم مشاعرے کی نقل نہیں ہے۔ اس میں دورِ متوسطین کے بارہ شاعروں سوداؔ، میر دردؔ۔ میر تقی میرؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، انشاؔ، آتشؔ، نسیمؔ، ناسخؔ، مومن اور غالب کو پیش کیا گیا ہے۔ ان شعرا کا ایک ساتھ جمع کرنا تاریخی اعتبار سے تو ممکن نہیں تھا اس لیے انہیں عالم بالا سے مدعو کیا گیا ہے اور اسی مناسبت سے ہر شاعر کی عمر وہ دکھائی گئی ہے جس میں اس کا انتقال ہوا کلام پڑھنے کی ترتیب وہ رکھی گئی ہے جو ان سب کی موت کی تھی۔ یہ مشاعرہ ۲۲، ۲۳، ۲۴ مارچ ۱۹۳۹ کو گورنمنٹ کالج لائل پور میں مصنف کی زیرنگرانی اسٹیج کیا گیا اس میں پندرہ طلبہ نے شاعروں کا کردار ادا کیا۔

اس تمثیل کو پڑھ کر علامہ کیفی کی سخن فہمی تبحر علمی اور وسعت نظر کا معترف ہونا لازمی ہے۔ علامہ کی ساری عمر دہلی ہی میں گزری اور طبقہ اعلیٰ سے مراسم رہے۔ انہیں تمام ہندوستان کے بڑے بڑے مشاعروں میں شریک ہونے کا موقع ملا قدیم مشاعروں کا سارا ماحول ان کی آنکھوں دیکھا تھا۔ پھر علامہ صرف ادیب اور شاعر ہی نہیں ناقد اور مصلح بھی تھے۔ اس لیے ان کی تحریر نے اس مشاعرے کو قدیم ادبی تاریخ، روایات اور تلمیحات کا مرقع بنا دیا ہے۔

اختتام مشاعرہ کے بعد کتاب کے آخر میں چند تشریحی اور تلمیحی نوٹ دیے گئے ہیں جن کو پڑھنے سے ایسے قارئین جو ادبی روایت یا واقعے سے واقف نہیں وہ پوری طرح محظوظ ہو سکتے ہیں۔ نیز شعراء کے لباس اور حلیے کی پوری تفصیل بھی درج ہے۔ تاکہ اگر کوئی اسے ڈرامائی انداز میں پیش کرنا چاہے تو کسی قسم کی پریشانی نہ ہو۔

ایک اور تمثیل ''برزخ کا مشاعرہ'' ڈاکٹر سید محمد حسنین کی تحریر ہے جو گیا کالج ''گیا'' میں اردو کے پروفیسر تھے اور کالج کی ''اردو مجلس'' کے سرپرست اور روح رواں تھے۔ یہ تمثیل انہوں نے جولائی ۱۹۵۷ میں کالج کے سالانہ جلسے کے لیے لکھی اور انہی کی نگرانی میں اسٹیج کی گئی ڈاکٹر سید محمد حسنین زمانہ طالب علمی میں بھی ایک تمثیلی مشاعرے ''روحوں کا مشاعرہ'' میں جو پٹنہ کالج کی بزم ادب کے سالانہ جلسے میں ہوا تھا۔ ''رند'' کا کردار ادا کر چکے تھے۔

اس تمثیل کے آغاز میں توضیح کے عنوان سے ہدایات دی گئی ہیں۔ اسٹیج کے منظر، شعراء کے لباس، ترتیب نشست کے بارے میں نقشہ دیا گیا ہے پس منظر اور پیش منظر بڑی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے اگر اسٹیج پر اس کا خیال رکھا جائے تو عالم برزخ کا ایک بھرپور تاثر قائم ہو سکتا ہے۔

اس مشاعرے میں اردو شاعری کے اہم مراکز کی چند معروف شخصیات کو پیش کیا گیا ہے جس میں میر تقی میر کے دور سے لے کر بیسویں صدی کے جدید شعراء کی شاعری ادبی اور ثقافتی پس منظر کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ حاشیے میں ان لطیف اشاروں اور چشمکوں کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ جس سے تمثیل میں ادبی رنگ پیدا کیا گیا ہے۔

یہ مشاعرہ ۱۹۵۷ کے بعد دوبارہ ۱۹۷۲ میں ترمیم و اضافے کے ساتھ شایع ہوا پہلی اشاعت سے پہلے اسے دو بار کالج کی ادبی مجلسوں کے موقع پر اسٹیج کیا گیا پھر دوسرے کالجوں نے جب اس کا مسودہ اسٹیج کرنے کے لیے مانگا تو اسے شایع کروا دیا گیا۔

''لکھنؤ کی آخری شمع'' کے نام سے ابولیث صدیقی انتظام اللہ شہابی اور مولانا عبدالسلام نے ایک تمثیل مرتب کی ہے جو لکھنؤ کے آخری تاجدار واجد علی شاہ اختر کی سرپرستی میں ہونے والے لال بارہ دری کے مشاعرے کی نقل ہے جو ۱۲۶۷/ ۱۸۵۱ میں ہوا تھا اس مشاعرے کا ذکر تذکرہ ''سراپا سخن'' میں ہے اس کے علاوہ اودھ اخبار اور علی گڑھ اخبار میں بھی اس مشاعرے کا ذکر ہے۔

واجد علی شاہ نے لال بارہ دری میں مشاعرے کے انعقاد کا حکم دیا تھا جس کی تعمیل کے لیے مہتمم میر اسد صبر بلائے گئے اور بادشاہ نے دو مصرعے طرح کے اور ایک موضوع بھی دیا تھا اس تمثیل کے آغاز میں شاعروں کی نشست کا نقشہ دیا گیا ہے اس میں بادشاہ بھی شریک تھے اور چالیس شعراء مدعو کیے گئے تھے۔ اس تمثیل میں ادبی تاریخ کے کئی چھوٹے چھوٹے واقعات

بیان کیے گئے ہیں جو قاری کی معلومات کے ساتھ تمثیل کی دلچسپی میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔

''آخری بزم'' انتظام اللہ شہابی کی تحریر کردہ ہے یہ کسی مشاعرے کی تمثیل نہیں ہے ۱۹۵۹ کی تحریر کردہ اس کتاب میں دہلی، آگرہ اور لکھنؤ کی چند ادبی صحبتوں کو تمثیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ماضی کی حسین صحبتوں کی یادگار ہے۔ اس کی بدولت ہم عہد رفتہ کی ان محفلوں کا لطف اٹھا سکتے ہیں اس تمثیل میں ادبی صحبتوں اور مشاعروں کی تہذیبی اور ثقافتی قدروں کا ذکر تاریخی شواہد اور سندات کے ساتھ تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اس تمثیل کے چند اجزاء ''مصنف علی گڑھ''، العلم کراچی اور قومی زبان کراچی میں شایع ہو چکے ہیں۔

اردو شاعری کے تین اہم ادبی مراکز کی ادبی صحبتوں اور مشاعروں کو تمثیلی انداز میں پیش کر کے مصنف نے تینوں مراکز کا فرق بھی واضح کر دیا ہے ہر مرکز اپنے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کا آئینہ دار ہے۔

ایک اور نہایت دلچسپ تمثیلی مشاعرہ ''جنت کا مشاعرہ'' کے عنوان سے عارف بٹالوی نے تحریر کیا ہے جس میں جنت میں مقیم شعراء کے ایک مشاعرے کا احوال رقم کیا ہے جنت میں مقیم شعراء کو اپنا کلام سنانے کا موقع نہیں ملتا تھا وہ اس بات پر بہت افسردہ تھے پھر جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے خصوصی اجازت لے کر ایک ہفتے کے لیے بزم ادب آراستہ کی گئی جس میں چار نشستوں میں مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ ہر نشست میں صدر مشاعرہ اور شعراء مختلف تھے چوتھی اور آخری نشست میں تمام شعراء نے شرکت کی۔

پہلی نشست کے صدر ولی دکنی تھے اور متقدمین میں سے سات نمائندہ شعراء نے کلام سنایا۔ دوسری نشست کی صدارت حضرت مظہر جان جاناں کے سپردگی کی گئی اور شریک شعراء دورِ متوسطین سے تعلق رکھتے تھے۔ تیسری نشست کے صدر مجلس مرزا اسداللہ خان غالب تھے اور شریک شعراء ناسخ، آتش، شاہ نصیر، مومن اور ذوق تھے۔ چوتھی اور آخری نشست میں سب شعراء شریک تھے۔ اسٹیج پر کرسیاں ایک مخصوص ترتیب سے رکھی گئیں ہیں ان کرسیوں پر بالترتیب شعراء اور سلاطین جس طرح آئے بیٹھتے گئے اس سلسلے میں مصنف نے متقدمین، متوسطین اور متاخرین کی ترتیب کا خاص خیال رکھا ہے اور ان سلاطین کو جنھوں نے شعراء کی سرپرستی میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں ہر طبقے کے ساتھ بٹھایا ہے۔

مصنف نے شاعروں کی نشست کی جو ترتیب رکھی ہے۔ وہ ادب کے ایک ارتقائی خاکے کی صورت ہے آغاز اردو شاعری امیر خسرو، امیر خسرو کے خاص کرم فرما بادشاہ غیاث الدین بلبن اور غالب بطور شہنشاہ سخن اولین درجے میں شامل کیا ہے اس کے بعد فارسی، ہندی اور بنگالی کے نامور اور ابتدائی شاعر جنھوں نے اردو شاعری کو اپنے کلام سے تقویت بخشی جس میں نظامی (مثنوی کلام راؤ پدم راؤ) کالیداس (منظوم ڈرامہ شکنتلا) اور فارسی کے وہ شعراء جن کو برصغیر میں فارسی کے عروج کے زمانے میں خاص طور سے پسندیدگی اور تقلید کے حوالے سے اہمیت حاصل رہی سعدی، انوری اور ظہوری کی نشستیں ہیں۔

اس کے بعد کی نشستوں پر شعرائے متقدمین میں سے ولی دکنی جو اردو شاعری کے باوا آدم ہیں۔ پھر خان آرزو جنھوں نے اردو شاعری کی فروغ میں کلیدی کردار ادا کیا۔ پھر اس دور کے اہم سلاطین جو شعر و ادب کے قدردان تھے شجاع الدولہ، محمد شاہ ان کے بعد ولی کو اردو شاعری کی طرف راغب کرنے والے سعداللہ گلشن۔

اگلی نشستوں پر شعرائے متوسطین اردو شاعری کے عہد زریں کے اہم نام اور شاہ عالم بادشاہ، آصف الدولہ اس کے بعد اصلاح زبان کے حوالے سے اہم نام جس میں خان آرزو کے بعد مرزا مظہر جان جاناں ناسخ، آتش، شاہ نصیر اور آخر میں متاخرین میں سے داغ دہلوی۔

الغرض یہ تمثیل اردو شاعری کے آغاز سے لے کر دورِ متاخرین تک کے شعراء کی ایک ادبی تاریخ ہے۔ جنت میں مشاعرہ پر تاریخ اشاعت درج نہیں لیکن مشاعرے کے احوال میں ایک مقام پر مصنف نے لکھا ہے کہ ۱۹۰۵ کے بعد ۱۹۴۵ میں

ملاقات ہوئی اس داخلی شہادت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمثیل ۱۹۴۵ کی تحریر کردہ ہے۔

تمثیلی مشاعروں کی تین چار اور کتابوں کا ذکر بھی تاریخ کی کتابوں اور تمثیلی مشاعروں کی تفریظ اور تعارف میں ملتا ہے جن میں سے مشاعرہ عالمِ ارواح جو مرتضیٰ حسین موسوی کی تصنیف ہے فی الوقت دستیاب نہیں ہوسکی۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر سید محمد حسنین نے برزخ کا مشاعرہ میں ایک اور تمثیلی مشاعرے کا ذکر کیا ہے جو ۱۹۴۴ میں پٹنہ کالج میں سید مجتبیٰ احمد نے مرتب کیا تھا۔ جس کا سراغ ہمیں نہیں مل سکا۔ انتظام اللہ شہابی کی آخری بزم کی تفریظ میں جو جناب فروغ علوی کا کوروی کی تحریر کردہ ہے میں دو اور کتابوں کو تمثیلی مشاعرہ کہا گیا ہے ایک مولوی اکرام اللہ کی تصویر الشعراء اور دوسری نیاز علی پریشاں کی ''شعر سخن'' ان کتابوں کے بارے میں مصنف لکھتے ہیں کہ اولذّ کر کا ذکر حامد حسن قادری کی داستان تاریخ اردو میں ہے۔

داستان تاریخ اردو میں حامد حسن قادری مفتی اکرام اللہ صدیقی کے احوال میں ان کی تصانیف کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''ان میں تصویر الشعراء خاص چیز ہے اس زمانے میں آگرہ شعراء شہر و بیرون شہر کا اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا اکثر شعر و شاعری کے چرچے رہتے تھے مولوی غلام شہید رحمتہ اللہ علیہ کی ذات بابرکات نے اس میں عجیب روح پھونک دی تھی چناچہ ۱۸۶۱ع (۱۲۷۷) میں بابو بنی پرشاد وکیل صدر کے مکان پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا مشاعرے کے سخنوروں کے کلام اور حالات مفتی اکرام اللہ نے مرتب کیے اور اس گلدستہ کا تاریخی نام تصویر الشعراء ۱۲۷۷ رکھا ۱۸۶۱ع میں مرزا علی حسین مبصر کے مطبع حیدری میں طبع ہوا''۔ (۷)

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی تمثیل نہیں ہے بلکہ ایک مشاعرے کا گلدستہ ہے یہ کتاب بھی دستیاب نہیں ہے اور یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جاسکتی، ہوسکتا ہے مفتی صاحب نے اس میں تمثیل کا رنگ بھرا ہو باوجود یکہ یہ ایک مشاعرے کا گلدستہ ہے یہ امر ابھی تحقیق طلب ہے۔

موخر الذکر کتاب نیاز علی پریشاں کی ''شعر سخن'' ہے جس کے لیے مصنف نے لکھا ہے کہ حامد حسن قادری کی نقد و نظر میں اس کا ذکر ہے اور خطبات گارسان دتاسی میں بھی اس کا ذکر ہے۔

حامد حسن قادری گارسان دتاسی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:۔

> ''آگرہ کا ایک قدیم مشاعرہ منعقدہ ۱۸۶۹ خطبات گارسان ودتاسی میں نظر سے گزرا کہ آگرہ میں اکتوبر ۱۸۶۹ میں ایک شاندار مشاعرہ ہوا تھا دتاسی لکھتا ہے۔
>
> اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۹ میں ان شعرا کے لیے ہدایات کا اعلان شایع ہوا جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہیں ان ہدایات میں یہ بھی ہے کہ شعراء پہلے سے اپنا نام تخلص مذہب، عمر، استاد کا نام اور یہ کہ آیا استاد زندہ ہے یا فوت ہوگیا ہے۔ مطبوعہ دواووین کے نام اور دوسرے حالات کے متعلق اطلاع دیں۔۔۔ میرے دوست مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی صدیقی اکبرآبادی کے کتب خانے میں اس مشاعرے کا گلدستہ نکل آیا۔۔۔ بانی مشاعرہ منشی نیاز علی پریشاں اکبرآبادی نے اس مشاعرے کے ذریعے سے اپنے معاصرین کا تذکرہ مرتب کرنا چاہا تھا۔۔۔ اس تذکرے کا تاریخی نام شعر و سخن (۱۸۸۶) بھی خوب ہاتھ آیا یکم اگست ۱۸۶۹ کو اشتہار تقسیم کیے گئے کہ ۱۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ کو مشاعرہ ہوگا فارسی اور اردو کی دو طرحیں دی گئیں''۔ (۸)

خطبات گارساں دتاسی میں ذکر ہے کہ

> ''مشاعروں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۱۶ اکتوبر ۱۸۶۹ کو ہوا ہوگا اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۸۶۹ میں ان شعرا کے لیے ہدایت کا اعلان شایع ہوا تھا جو اس مشاعرے میں شرکت کرنا چاہتے ہوں''۔ (۹)

اس کے بعد وہی تفصیل ہے جو حامد حسن قادری نے دی ہے ان بیانات میں کہیں اسے تمثیلی مشاعرہ نہیں کہا گیا بلکہ

یہ بھی آگرہ کے ایک بڑے مشاعرہ کا گلدستہ یا اس دور کے معاصر شعراء کا تذکرہ ہے جو اس مشاعرے میں شریک ہوئے تھے۔ لہذا اس طرح موجودہ تحقیق تک یہ کتاب تمثیلی مشاعرے کے ذیل میں نہیں آسکتی۔

تمثیلی مشاعروں کی ان کتابوں کے علاوہ مشاعروں پر تمثیلی مضامین بھی لکھے گئے ہیں اس سلسلے میں علامہ نیاز فتحپوری کا ایک مضمون لکھنو کے مشاعرے پر ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں مشاعروں کی تماثیل پیش کرنے کا ذکر ملک زادہ منظور احمد نے رقص شرر میں بھی کیا ہے جارج اسلامیہ کالج وہائی اسکول میں ملک زادہ نے تعلیم حاصل کی تھی اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

''منظور علی عربی کے استاد تھے مگر وہ ادبی تقریبات کے روح رواں ہوا کرتے تھے انہوں نے دو مرتبہ تمثیلی مشاعرے کروائے تھے اور دونوں میں میں نے اداکاری کے جوہر دکھائے تھے''۔ (۱۰)

بدلتے وقت اور برقی ذرائع ابلاغ کی ترقی کے بعد ہمارے ہاں کئی فلمیں ایسی بنائی گئیں اور ٹی۔وی پر کئی ایسے ڈرامے پیش کیے گئے جن میں ان قدیم شعراء کے مشاعروں کو دکھایا گیا اور بڑی سچی قلمی تصویریں ہی نہیں چلتی پھرتی بولتی چالتی تصویر پیش کی گئیں۔

اس حوالے سے کلکتہ میں ایک فلم میں عالم ارواح کے ایک تمثیلی مشاعرے کی فلم بندی کا ذکر کلکتہ کی ادبی داستانیں میں ریڈیو پاکستان ڈھاکہ کے ریجنل ڈائرکٹر جناب کلیم اللہ کے ایک مضمون مطبوعہ مہر نیم روز کراچی وحشت نمبر ستمبر ۱۹۵۷ کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولانا رضا علی وحشت نے نذر الاسلام کے بارے میں انٹرویو میں کہا کہ

''ایک فلم کمپنی نے جس کا اسٹوڈیو ٹالی گنج میں تھا ارادہ کیا کہ ایک فلم بنائیں جس میں عالم ارواح کا ایک مشاعرہ دکھایا جائے شعراء جہاں تک مجھے یاد ہے مشاعرے کی شرکت کرنے والے میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، اور داغؔ قرار پائے ایسا انتظام ہوا کہ میرؔ کا پارٹ نذر الاسلام صاحب کو دیا جائے، غالبؔ کا اس حقیر کو، مومنؔ کا ساغر نظامی کو اور داغؔ کا جگر مرادآبادی کو''۔ (۱۱)

اس طرح کی کئی مثالیں ملتی ہیں جس میں قدیم ادبی صحبتوں اور مشاعروں کو دکھایا گیا ہے۔ ان مشاعروں میں جس ماحول اور دور کی عکاسی کی گئی ہے اس کے لیے بھی تاریخ ادب کی کتابوں کے ساتھ ان تمثیلی مشاعروں سے بھی استفادہ کیا گیا ہوگا کیونکہ ان میں جس طرح ہر چیز تفصیل سے بیان کی گئی ہے اس طرح تاریخ ادب میں نہیں ملتی۔

یہ تمثیلی مشاعرے علمی، ادبی اور تاریخی اہمیت کے حامل ہیں تاریخ جن واقعات کو سرسری بیان کرتی ہے یہ تماثیل ان کی جزئیات بھی بتاتی ہیں۔ ادبی تاریخ کے یہ مرقع اس لیے بھی اہمیت رکھتے ہیں کہ ادب کی عہد بہ عہد ترقی، میلانات ورجحانات ہر دور کے سیاسی اور سماجی حالات بھی ان میں محفوظ ہو گئے ہیں فرحت اللہ بیگ نے مغلیہ دور کے پورے ماحول کو اپنے مشاعرے میں زندہ کر دیا ہے۔ آداب شاہی سے لے کر آداب مشاعرہ تک، شاعروں کے لباس، مزاج، وضع قطع اندازِ گفتگو نشست و برخاست اور مشاعرہ گاہ کی آرائش و زیبائش کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ اس تمثیل میں بعض آرائشی اشیاء اور لباس کے ایسے نام بھی ہیں جنہیں آج ہم نہیں جانتے اس طرح یہ قدیم طرز معاشرت سے واقفیت کا بھی ذریعہ ہیں۔

اسی طرح لکھنو کی آخری شمع میں لکھنوی تہذیب وتمدن، شاہانہ ٹھاٹ باٹ اور فارغ البالی کی وجہ سے لکھنو جس مخصوص تہذیب کا نمونہ تھا اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے احسن مارہروی نے رام پور کے درباری مشاعرے کی مرقع کشی میں وہاں کے ماحول کو پیش نظر رکھا ہے۔

آخری بزم میں آگرہ، دہلی اور لکھنو کی ادبی صحبتوں کے تمثیلی احوال میں تینوں ادبی مراکز میں مشاعروں کے آغاز اور ارتقاء کو انتظام اللہ شہابی کے قلم نے ابدی زندگی عطا کر دی ہے۔

برزخ کا مشاعرہ میں مختلف ادوار کے شعراء کو یکجا کر دیا گیا ہے اس طرح یہ کسی ایک دور کی عکاسی سے زیادہ مشکل کام ہے کہ ہر دور کے شاعرانہ رجحانات، ماحول اور مشاعروں کے آداب مختلف رہے رہیں۔ اسی طرح تمثیلی مشاعرہ برج موہن دتاتریہ کیفی میں بھی مختلف دور کے شعرا ہیں اور جنت کا مشاعر میں بھی امیر خسرو سے داغ دہلوی تک کے ادوارِ شاعری کا احاطہ کیا گیا ہے جو مصنفین کو داد کا حقدار بناتی ہیں۔

یہ تمام تماثیل اردو شاعری کے عہد ارتقاء کی دلچسپ سند ہیں۔ تاریخ ادب کے بے شمار واقعات جو تذکروں اور گلدستوں میں بکھرے ہوئے ہیں ان تماثیل کے ذریعے ایک دور اور زمانے کے شعرا کے ساتھ یکجا کر دیے گئے ہیں اور اندازِ بیاں ایسا دلچسپ ہے کہ قاری بغیر ختم کیے نہیں چھوڑ سکتا۔

ان میں چند تماثیل طلبہ میں ذوق ادب پیدا کرنے کے مقصد سے کالجوں میں اسٹیج کرنے کے لیے لکھی گئیں ہیں کیونکہ کتابوں میں پڑھی ہوئی باتوں سے زیادہ دیکھی ہوئی باتیں یاد رہتی ہیں اور اس طرح طلبہ نہ صرف شاعری سے بلکہ شاعر کی شخصیت سے بھی واقف ہو سکتے ہیں، ان تمثیلوں میں اس مخصوص دور کا ماحول، آداب محفل، شائستگی اور رکھ رکھاؤ دکھا کر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ ہم اپنی تہذیبی اقدار کو فراموش نہ کر دیں۔ ڈاکٹر سید محمد حسنین نے کچھ اس قسم کے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''گھر کی تاریکی دن بدن بڑھتی جاتی ہے اور باہر کا اجالا ہمارے ہوش وخرد کو تار تار کرتا جا رہا ہے۔ ہم میں عرش پردازی کا حوصلہ تو آ گیا حیف وصد حیف مگر خاک نشینی کا سلیقہ نہ آیا زمانہ کبھی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتا اور وقت کسی کا انتظار بھی نہیں کرتا عہد رفتا کی صالح روایتیں اور عہد نو کی برکتیں ہمارا سرمایا حیات ہیں انھیں سینے سے لگا کر اور سمیٹ کر ہمیں آگے بڑھنا ہے''۔ (۱۲)

فرحت اللہ بیگ نے یادگار مشاعرہ اسٹیج کرنے کی غرض سے نہیں لکھا تھا مگر اس میں جس خوبی سے مغلیہ دور کی عکاسی کی گئی ہے اس نے اسے بار بار اسٹیج کروایا۔

داستان، ناول، افسانہ یا ڈرامہ میں جس طرح ایک دور کی تہذیب ومعاشرت طرز احساس اور طرز فکر کو پیش کیا جاتا ہے اور وہ اپنے دور کی عکاسی کرتا ہے اسی طرح یہ تماثیل شاعروں کے حوالے سے اپنے دور کے سیاسی اور سماجی حالات کی بھی عکاس ہیں ہر مصنف نے دور کی تفصیل بھی لکھی ہے اس کے ساتھ ساتھ شاعر کا کلام جو داخلی شہادت دیتا ہے وہ بھی اہم ہے۔ شاعر کا کلام ہو یا صنف نثر کی کوئی تخلیق ادب کی تمام اضاف اپنے عصر کا آئینہ اور تنقید حیات ہوتی ہیں۔ شاعر کے کلام سے ہم اس دور کے طرز احساس اور طرز فکر کو جان سکتے ہیں۔

ان تماثیل میں مختلف شاعروں کا طرحی اور غیر طرحی کلام یکجا ہے اس میں شاعروں کی اصلاح بر سر مشاعرہ تنقید وتعریض کے جو واقعات درج ہیں وہ نو آموز ہی نہیں ہر شاعر اور ادب کے ہر طالب علم کے لیے کار آمد ہیں زبان کا استعمال، محاورے اور روزمرہ کا برتنا، ترتیب الفاظ غرض شاعری کے تمام رموز اس سے سمجھے جا سکتے ہیں جہاں شاعر دوسرے شاعر کے کلام کی تعریف کرتا ہے نازک خیالی یا تشبیہ کی داد دیتا ہے۔ پڑھنے والے بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔

پنڈت وتاتریہ کیفی نے اپنے تمثیلی مشاعرے میں تمثیل کی افادیت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بدلتے وقت کے تقاضوں نے جہاں ہر چیز بدل دی ہے ادب بھی جدتوں سے آشنا ہوگا۔ لیکن اختراع اور جدت طرازی کے طوفان میں کہیں شعر سے شعریت ہی ختم نہ ہو جائے۔ ''مادی اور دنیاوی مکروہات کا مضائقہ نہیں لیکن زبان کی جگری لطافت اور شعریت قائم رہیں''۔ (۱۳) ان مشاعروں کے ذریعے ایسی صحبتوں کے نمونے آنے والوں کے سامنے موجود ہوں گے تو وہ اس کو باقی رکھنے کی سعی کریں گے۔

یہ تماثیل ادب کے طلبہ کے ساتھ ساتھ عام قاری اور خاص طور سے شاعرانہ ذوق رکھنے والوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ ادبی تاریخ اور شاعروں کی شخصیت کے وہ حصے جو عام طور سے تاریخ اور تنقید کی کتابوں میں نہیں ملتے ان تمثیلوں میں ڈرامائی انداز میں آ کر ذہنوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔

ان مشاعروں میں مختلف شعراء کی ہم طرح غزلوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے بعض مشاعروں میں تو ایک ہی شاعر کی تین تین چار چار ہم طرح غزلیں درج ہیں اس کے علاوہ کئی شعرا کے ہم مضمون اشعار بھی ملتے ہیں۔ گلدستہ معنی کو سو رنگ سے باندھنے کا خاص انداز جب ہم مختلف شعراء کے کلام میں دیکھتے اور پڑھتے ہیں تو خود بخود موازنہ کر کے اعلیٰ اور ادنیٰ کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ مشاعرہ اگر حقیقی بھی ہو تو ایک تنقیدی پہلو رکھتا ہے اور جب تمثیل مشاعروں میں ایک ساتھ ساتھ ہمیں مختلف شعراء کی ہم طرح اور ہم موضوع غزلیں پڑھنے کو ملتی ہیں تو ہمارا تنقیدی شعور بھی ترقی کرتا ہے۔ مصنف نے اپنے تنقیدی شعور کو استعمال کر کے شاعروں کے جس کلام کا انتخاب کیا ہے وہ ان کے کلام کا عطر ہیں۔ مختلف شعراء کی مشہور اور فنی اعتبار سے اعلیٰ ترین غزلیں جمع کر دی ہیں جو از خود قاری سے فیصلہ کروا لیتی ہیں کہ کس کا کلام اور مقام اعلیٰ ہے۔

شاعروں کی معاصرانہ چشمک کے واقعات سے ادبی تاریخ پر ہے ان میں سے چند اہم اور بڑے معرکوں کا ذکر ان تمثیلوں میں بھی آ گیا ہے۔ جب ہم کوئی ہلکا سا اشارہ اس میں کسی معاصرانہ چشمک کا پاتے ہیں تو اس کی تفصیل اور اصل بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ اکثر مصنفین نے بقدر ضرورت تفصیل بھی دی ہے۔ اس طرح ادبی تاریخ کے وہ حصے جو شاید تاریخ کی کتابوں سے کبھی نہ پڑھے جاتے ہوں ان تماثیل کا حصہ بن کر پڑھ لیے جاتے ہیں۔

مشاعرے کا ادارہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا اردو شاعری اس تربیتی ادارے نے عہد بہ عہد اپنے انعقاد کے انداز جس طرح بدلے ہیں اس کا سراغ بھی ہمیں ان تماثیل میں مل جاتا ہے۔ شروع شروع میں مشاعروں کے آداب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔ شاہی سرپرستی میں ہونے والے مشاعروں میں سلاطین خود شریک ہوتے تھے۔ انتہائی خاموشی سے کلام سنا جاتا اور داد بھی دھیمی آواز میں دی جاتی، اساتذہ کی خاموشی ناپسندیدگی کو ظاہر کرتی وہ سر جھکانے آنکھیں بند کیے کلام سنتے اچھے شعر پر نظر اٹھا کر ستائشی نظر سے شاعر کو دیکھتے اور ایک آدھ جملے تعریفی کہہ دیتے۔ آداب محفل کا بھی خاص خیال رکھا جاتا تھا، حفظ مراتب کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ شاعروں کی نازک مزاجیاں اور قدر دانوں کی ناز برداریاں دیدنی تھیں۔ رفتہ رفتہ تبدیلیاں آتی گئیں۔ سیاسی اور سماجی تنزل نے اس ادارے کو بھی متاثر کیا۔ اصلاح شعر کے ساتھ اساتذہ شاگردوں کو غزلیں کہہ کر دینے لگے۔ مشاعروں کے آداب باقی نہ رہے شور وغل، ہوٹنگ، تالیاں بجا کر داد دینا۔ دکھڑے ہو کر شعر پڑھنا۔ یہ سب انداز جدید دور میں مشاعروں میں داخل ہو گئے۔ ان تمثیلوں میں زیادہ تر قدیم دور کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس لیے یہ عہد رفتہ کی تہذیب و شائستگی کا نمونہ ہیں۔ ماضی میں ہماری معاشرتی اقدار کیا تھیں۔ آداب محفل کیسے تھے، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے شفقت، بڑے سے بڑا شاعر بھی نو آموز کی کس طرح حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ شعرا کی معاصرانہ چشمکوں اور معرکہ آرائیوں کے باوجود ایک دوسرے سے ادب لحاظ اور مروت کا برتاؤ کرتے تھے۔ سوائے ایک آدھ مثال کے جو کچھ ابتذال کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ بحث و مباحثہ شاعری کی حد تک ہوتا تھا۔ یہ تمام تاریخی حقائق ان مشاعروں کی تمثیلوں میں موجود ہیں اس لیے ان کی علمی و ادبی اہمیت کسی طرح ادب کی دیگر کتابوں سے کم نہیں۔

رامپور کے مشاعرے کی تمثیل میں ملا رموزی انجمن خیابان ادب کے تحت ہونے والے مشاعرے کی روداد میں تمثیلی مشاعرے کے انعقاد کو علم و ادب کی تحقیق و ترقی میں شامل کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ اس تمثیل کے ذریعے سارے ہندوستان کے مشاعروں کی اصلاح اور ماحول کی تبدیلی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ہمارے قدیم مشاعرے کے آداب اور ماحول کیا تھا اور نصف صدی کے عرصے میں اب کیا ہو گیا ہے۔

ادبی تاریخ کے یہ تمثیلی مرقعے اتنے ہی وقیع ہیں جتنی کہ تاریخ، تاریخ کی کتابوں میں جن حقائق کو سادہ تحقیقی انداز میں رقم کیا جاتا ہے تمثیل نگاران میں اپنے موئے قلم سے خوبصورت رنگوں کا اضافہ کر کے دلچسپ بنا دیتا ہے۔ یہ ادب کے خزینے میں اہم اضافہ ہیں ان کی دلچسپی ان کے مصنفین کے اسلوب نگارش کا کرشمہ ہیں جن کی بدولت یہ ہر قاری کے لیے دلچسپ تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ سحر انصاری (تعارف نو) تمثیلی مشاعرہ از احسن مارہروی۔ احسن مارہروی اکیڈمی ۱۹۹۵ طبع دوم ص ۲

۲۔ فرحت اللہ بیگ، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس جید پریس دہلی سن ن دص ۵

۳۔ ابواللیث صدیقی، واجد علی شاہ کی ایک نادر تصنیف، مشمولہ نقوش ادب عالیہ نمبر مدیر محمد طفیل شمارہ ۷۹، ۸۰، ادارہ فروغ اردو لاہور اپریل ۱۹۶۰ ص ۲۶۲

۴۔ فیلن و کریم الدین، طبقات شعراء ہند مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸، طبع اول، ص ۴۰۰، ۴۰۱

۵۔ فرحت اللہ بیگ، دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس جید پریس دہلی سن ن دص ۴

۶۔ ایضاً، ص ۵

۷۔ حامد حسن قادری، داستان تاریخ اردو، اردو اکیڈمی ۱۹۶۶، طبع سوم ص ۳۷۶

۸۔ حامد حسن قادری، نقد و نظر، اردو اکیڈمی، ۱۹۸۶ طبع اول (پاکستانی ایڈیشن) ص ۱۴۶، ۱۴۷

۹۔ گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی (حصّہ دوم مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۴، طبع دوم ص ۳۰۶

۱۰۔ ملک زادہ منظور احمد، رقص شرر، مجلس فروغ اردو ادب، دوحہ (قطر)، ۲۰۰۴، طبع اول ص ۲۵، ۲۶

۱۱۔ ڈاکٹر وفا راشدی، کلکتہ کی ادبی داستانیں، ایجوکیشنل پریس کراچی، ۱۹۹۹، طبع اول، ص ۲۱۹، ۲۲۰

۱۲۔ سید محمد حسنین، برزخ کا مشاعرہ، کتاب منزل پٹنہ، ۱۹۷۲، طبع دوم، ص ۲۷

۱۳۔ برج موہن دتاتریہ کیفی، تمثیلی مشاعرہ، انجمن ارباب ذوق لائل پور، ۱۹۳۹، طبع اول، ص ۸۸